36

1۔جلسہ سالانہ کے موقع پر قادیان جانے کی اہمیت

2۔درد صاحب مرحوم نے چالیس سال تک نہایت ثابت قدمی کے ساتھ سلسلہ کی خدمت کی ہے

(فرمودہ 9؍دسمبر 1955ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا۔

"آج مجھے مرزا عزیز احمد صاحب (جو محکمہ حفاظتِ مرکز کے انچارج ہیں) کی طرف سے اطلاع ملی ہے کہ اِس دفعہ جلسہ سالانہ کے موقع پر قادیان بہت کم دوست جارہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شاید اِس کی وجہ یہ ہے کہ قادیان جانے کے لیے پاسپورٹ اب آسانی سے مل جاتے ہیں اس لیے بہت سے دوست سال کے دوران میں قادیان ہو آئے ہیں۔ لیکن یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ قادیان میں سال میں صرف ایک دو دفعہ جانے کی ہی ضرورت نہیں بلکہ جہاں کسی کا کوئی عزیز ہوتا ہے وہاں سوائے اشد مجبوری کے اُسے بار بار جانا چاہیے۔ اس لیے اگر دوست سال میں چار دفعہ بھی قادیان ہو آئے ہوں تب بھی جماعت کی عزت اور وقار کی خاطر انہیں اس جلسہ کے موقع پر قادیان جانا چاہیے۔ آخر انہیں خیال کرنا چاہیے کہ وہ ہجرت کے بعد اِس

طرف آ گئے ہیں اور یہاں آزاد ہیں۔لیکن ان کے جو بھائی قادیان میں رہ گئے ہیں اُن کو اتنی آزادی میسر نہیں جتنی ہمیں حاصل ہے۔اُن میں سے کئی ایسے ہیں جن کے پاسپورٹ گورنمنٹ نے جمع کر لئے ہیں۔ وہ منہ سے تو یہی کہتی ہے کہ جب ضرورت ہوئی یہ پاسپورٹ واپس دے دیئے جائیں گے لیکن عملی طور پر انہوں نے وہ پاسپورٹ اب تک واپس نہیں دیئے۔ پس اُن لوگوں کی دلجوئی کے لیے پاکستان کے احمدیوں کو جنہیں یہاں ربوہ میں جلسہ سالانہ دیکھنے کا موقع ملتا رہتا ہے (سوائے اُن لوگوں کے جن کے سپرد خاص خاص کام ہیں اور اُن کے قادیان چلے جانے سے یہاں کا جلسہ خراب ہو جاتا ہے) اس جلسہ کے موقع پر قادیان جانا چاہیے۔چاہے وہ سال میں چار دفعہ قادیان ہو آئے ہوں اُنہیں اِس موقع پر سُستی اور غفلت سے کام نہیں لینا چاہیے تا وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کو معلوم ہو کہ احمدی اپنے مقدس مرکز قادیان سے محبت کرتے ہیں اور ان کے جو بھائی قادیان رہ گئے ہیں اُن کی بھی دلجوئی ہو۔لیکن مجھے افسوس ہے کہ مرزا عزیز احمد صاحب نے یہ معاملہ ایسے وقت میں میرے سامنے پیش کیا ہے کہ دوستوں کو قادیان جانے کے لیے تیار کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ کیونکہ وہ لکھتے ہیں کل دس دسمبر کو ہم نے پاسپورٹ جمع کرانے ہیں اور آج 9 دسمبر کو انہوں نے یہ معاملہ میرے سامنے رکھا ہے۔ یہ تو اتنی غفلت ہے کہ اس کے معنے سوائے اِس کے اَور کوئی نہیں ہو سکتے کہ خود افسروں کو بھی اِس بات کا احساس نہیں کہ ہر کام وقت پر کیا جائے۔مرزا بشیر احمد صاحب (جب تک ان کی صحت اچھی تھی) اس بارہ میں کافی کوشش کرتے تھے اور ہر سال قادیان جانے کے لیے سو ڈیڑھ سو افراد کی درخواستیں آجاتی تھیں بلکہ جب شروع شروع میں افراد میں جوش زیادہ تھا تو دو دو تین تین سو افراد کی درخواستیں آجاتی تھیں۔اور دفتر کو قرعہ ڈال کر قافلہ میں جانے والوں کے متعلق فیصلہ کرنا پڑتا تھا۔ یہ جوشِ محبت قائم رہنا چاہیے بلکہ اِس کو زیادہ کرتے رہنا چاہیے۔ پاکستان کے لوگوں کو تو ربوہ آنے کا موقع ملتا ہی رہتا ہے۔ ہاں قادیان جانا ان کے لیے مشکل ہے اور وہی ان کے لیے زیادہ اہم بھی ہے تا کہ وہاں رہنے والوں میں مرکز کی خدمت کی روح قائم رہے اور اُن میں زندگی کے آثار باقی رہیں۔

پس گو اب تو کوئی وقت باقی نہیں رہا کہ میں بیرونی جماعتوں کے دوستوں کو قادیان

جانے کی تحریک کر سکوں لیکن ربوہ کے رہنے والے جن کے پاس پاسپورٹ ہوں اب بھی اِس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چنانچہ مرزا عزیز احمد صاحب نے لکھا ہے کہ ربوہ کے بہت سے افراد ایسے ہیں جن کے پاس پاسپورٹ ہیں اور وہ قادیان جا سکتے ہیں لیکن وہ جانے پر آمادہ نہیں۔ کیونکہ وہ سال کے دوران میں قادیان ہو آئے ہیں۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے قادیان سے ہو آنا کوئی دلیل نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ کیا انہیں ربوہ کا جلسہ سالانہ دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا؟ یا وہ سلسلہ کے ایسے اہم کاموں پر مقرر ہیں کہ ان کو چھوڑ کر جانے سے یہاں کا جلسہ خراب ہو جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ان کا فعل مستحسن ہے اور قابلِ مذمت نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں تو محض اِس لیے کہ وہ سال کے دوران میں قادیان ہو آئے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کو مل آئے ہیں ان کا اس موقع پر اسے قادیان نہ جانے کا بہانہ بنا لینا درست نہیں۔ رشتہ داروں کو ملنا ہی ان کی خواہش نہیں ہونی چاہیے بلکہ انہیں جماعت کی عزت اور وقار کے قائم رکھنے کے لیے بھی قادیان جانا چاہیے۔ اگر قادیان جانے والوں کی تعداد ہر سال کم ہوتی رہی تو اِس سے جماعت کی عزت اور وقار کو یقیناً صدمہ پہنچے گا۔

پس گو اِس وقت میری تحریک سے صرف یہاں کے لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن میں آئندہ کے لیے نصیحت کرتا ہوں کہ وقت سے پہلے افسروں کو اپنے کام کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ دس تاریخ کو جو کام ہونا ہے اُس کی 9 تاریخ کو اطلاع دینے میں کوئی بھی معقولیت نہیں۔ اگر مختلف جماعتوں میں پہلے سے تحریک کی جاتی اور مختلف افراد کو جو مبلغ یا کسی اَور حیثیت سے جماعتوں میں پھرتے رہتے ہیں اِس کام میں امداد کی تحریک کی جاتی تو لاکھوں کی جماعت میں سے قادیان جانے کے لیے دو تین سو افراد کا تیار ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ پس آئندہ کے لیے اِس غلطی کا ازالہ ہونا چاہیے اور شروع سال سے ہی اس کے لیے کوشش شروع کر دینی چاہیے۔

قوموں کی زندگی کا صرف ایک سال نہیں ہوا کرتا بلکہ قوموں کی زندگی کے سینکڑوں اور ہزاروں سال ہوتے ہیں۔ اس لیے ابھی سے اگلے سال کے قافلہ کے لیے تیاری شروع کر دینی چاہیے۔ اور ابھی سے لوگوں کے اندر ایسا جوش پیدا کرنا چاہیے کہ اگلے سال قافلہ میں جانے

والے افراد کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں قرعے ڈالنے پڑیں۔ اگر ایک سو آدمی قادیان جاتا ہو تو چار سو افراد کی طرف سے درخواستیں آئی ہوئی ہوں۔

اِس سال کچھ نقص اِس وجہ سے بھی ہوا ہے کہ پہلے گورنمنٹ ہمیں اکٹھے پاسپورٹ دیا کرتی تھی اور اس سے لوگ فائدہ اٹھالیا کرتے تھے الگ الگ پاسپورٹ بہت کم ملتے تھے۔ اب پاسپورٹ ملنے میں آسانی ہوگئی ہے اس لیے لوگ دورانِ سال میں کثرت سے قادیان جاتے رہتے ہیں۔ مگر اکیلے جانا اور جلسہ سالانہ کے موقع پر جانا دونوں میں فرق ہے۔ جلسہ سالانہ کے موقع پر جانے سے صرف قادیان کی زیارت ہی نہیں ہوتی بلکہ احمدیت کا وقار بھی بڑھتا ہے اور یہ دونوں الگ الگ اغراض ہیں۔ جیسے عمرہ اور حج دونوں کی الگ الگ اغراض ہیں۔ عمرہ میں بھی انسان خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے اور حج کے موقع پر بھی وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے۔ لیکن حج کی قیمت جو اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے وہ عمرہ کی نہیں رکھی۔ اور اِس کی وجہ یہی ہے کہ عمرہ کرنے کے لیے لوگ الگ الگ جاتے ہیں اور حج کے لیے ساری دنیا کے لوگ اکٹھے ہو کر جاتے ہیں۔ اس لیے حج کے موقع پر اسلام کا وقار بڑھتا ہے لیکن عمرہ میں محض خانہ کعبہ کی زیارت اور برکت ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے حج کو مقدم رکھا ہے۔

پس جلسہ سالانہ کے موقع پر قادیان جانے سے جماعت کا وقار بڑھتا ہے۔ ہجوم کو دیکھنے سے لوگوں کے دلوں پر اثر پڑتا ہے۔ اگر وہاں ایک ایک احمدی پھر رہا ہو تو اُس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ ہندوستان میں مسلمان تو پائے ہی جاتے ہیں۔ اس لیے وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کے لیے وہ کوئی عجیب چیز نہیں ہوں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ ایک مسلمان پھر رہا ہے۔ لیکن جلسہ سالانہ کے موقع پر سینکڑوں احمدیوں کا قادیان جانا اور سات سات آٹھ آٹھ لاریوں کا اکٹھا وہاں پر پہنچنا اُنہیں اِس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ابھی مسلمانوں میں دینی روح زندہ ہے اور احمدیوں کو اپنے مقدس مقام سے محبت ہے۔ پھر یہ بات اُن لوگوں کے دلوں میں بھی تعلق کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ وہاں کے رہنے والے چاہے وہ ہندو یا سکھ ہوں اب تک اُن کے دلوں میں یہ یقین پایا جاتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئی کے مطابق قادیان ضرور ترقی کرے گا[1]۔ ہمیں اُن کے اِس یقین کو گھٹانا نہیں چاہیے بلکہ بڑھانا چاہیے۔

اس کے بعد میں دوستوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت پرسوں درد صاحب اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک نے فوت ہونا ہے۔ درد صاحب تو اتنے بڑے پایہ کے آدمی نہیں تھے۔ ان سے بڑے بڑے پایہ کے لوگ بھی وفات پا گئے۔ رسول کریم ﷺ وفات پا گئے۔ آپ کے چاروں خلفاء وفات پا گئے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام وفات پا گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الاوّل وفات پا گئے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پرانے صحابہ ایک ایک کر کے وفات پا گئے۔ خود ان کے اپنے والد ماسٹر قادر بخش صاحب اور ان کے خسر میاں عبداللہ صاحب سنوری جو پرانے صحابہ میں سے تھے فوت ہو گئے۔ پس فوت تو سب نے ہونا ہے لیکن یہ طبعی بات ہے کہ پرانا تعلق ہونے کی وجہ سے صدمہ زیادہ ہوتا ہے۔ 1912ء سے درد صاحب کا میرے ساتھ تعلق تھا۔ 1914ء میں وہ قادیان سلسلہ کی خدمت کے لیے آ گئے تھے۔ 1924ء میں وہ انگلستان مبلغ بن کر گئے تھے۔ پھر دوبارہ 1933ء میں انگلستان گئے اور قریباً 6 سال وہاں رہے۔ غرض وہ دو دفعہ مبلغ بن کر انگلستان گئے۔ پہلی دفعہ 12 جولائی 1924ء کو قادیان سے روانہ ہوئے اور 22/ اکتوبر 1928ء کو واپس آئے۔ اور دوسری دفعہ 2/ فروری 1933ء کو قادیان سے روانہ ہوئے اور 9/ نومبر 1938ء کو واپس آئے۔ قادیان میں وہ سالہا سال تک صدر انجمن احمدیہ کے ناظر رہے اور سلسلہ کے اہم عُہدوں پر کام کرتے رہے۔ اتنے لمبے عرصہ تک جس شخص کے ساتھ تعلق رہا ہو اُس سے طبعاً محبت ہو جاتی ہے۔ ایک انسان کسی مکان میں لمبے عرصہ تک رہے تو اُس سے بھی محبت ہو جاتی ہے۔ پھر ایک انسان جس کے ساتھ روزانہ واسطہ پڑتا ہو اُس سے تو لازماً محبت ہو جاتی ہے۔ اِس لیے گو درد صاحب کی وفات کوئی عجیب چیز نہیں لیکن ان سے دیرینہ تعلق کی بناء پر ان کی وفات سے میرے دل کو اور دوسرے دوستوں کے دلوں کو بھی صدمہ پہنچنا ایک طبعی بات تھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کو جب صلیب پر چڑھانے کا وقت قریب آیا تو آپ نے دعا کی کہ اے اللہ! میری روح تو تیرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے مگر میرا جسم کمزور ہے [2]۔ پس جسمانی طور پر ایسی چیزوں کا صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ درد صاحب کی اچانک وفات سے مجھے بھی

صدمہ ہوا اور اِس صدمہ کی وجہ سے میری صحت پر بھی بُرا اثر پڑا۔ بھوک یکدم بند ہوگئی اور ٹانگیں کانپنے لگ گئیں اور چلنا مشکل ہو گیا۔ اِس کی یہ وجہ نہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔ یہ واقعہ بہرحال ہونا تھا کیونکہ ہر انسان نے ایک نہ ایک دن ضرور مرنا ہے۔ لیکن وہی حضرت مسیح علیہ السلام والی بات ہے کہ روح تو خدا تعالیٰ کا حکم ماننے کے لیے تیار ہے لیکن جسم کمزور ہے۔

پس یہ واقعہ غیر معمولی نہیں لیکن مجھے یہ خیال آتا ہے کہ مرنے والے تو بہرحال مرتے چلے جائیں گے ہمیں قومی زندگی کو قائم رکھنا چاہیے۔ یورپ میں ایک شخص مرتا ہے تو دس آدمی اُس جگہ پر کام کرنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں مرنے والے کی موت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا۔ دیکھو جرمنی کے بادشاہ ولیم سے جرمنوں کو اتنا عشق تھا کہ وہ اُس پر اپنی جانیں دیتے تھے مگر جب اتحادیوں نے اُسے شکست دے دی تو ہٹلر پیدا ہو گیا۔ پھر ہٹلر سے جرمنوں کو اتنا عشق ہوا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں لیکن جب ہٹلر چلا گیا تو ایڈنائر 3 پیدا ہو گیا۔ پس اگر مرنے والے کے بعد اُس کی جگہ لینے کے لیے اَور آدمی پیدا ہوتے رہیں تو قومیں مرتی نہیں زندہ رہتی ہیں۔ دیکھو! امریکہ میں ایک وقت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ پریذیڈنٹ روز ویلٹ کے بعد معلوم نہیں امریکہ کا کیا بنے گا۔ لیکن روز ویلٹ ایک دن یک دم مر گیا۔ اُس کا بھی ہارٹ فیل ہوا تھا اور وہ نہاتے نہاتے مر گیا تھا۔ لیکن لوگوں نے اُس کی موت کو زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ دوسرے لوگ اُس کی جگہ کام کرنے کے لیے آ گئے۔ گویا گاڑی کے گھوڑے گرتے پیچھے ہیں اور اُس میں جُتنے والے گھوڑے پہلے آگے آ جاتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی ہمت پَست نہیں ہوتی اور اس کا کام جاری رہتا ہے۔ اگر ہماری جماعت میں بھی ایسا ہی ہو تو گو مرنے والے سے تعلق ہونے کی وجہ سے اُس کی موت کا صدمہ ضرور ہوگا۔ مگر وہ صدمہ ایسا ہوگا جس کے ساتھ خوشی بھی ہوگی کہ قوم زندہ ہے۔

دیکھو رسول کریم ﷺ سے بڑا وجود اَور کون ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے تو خدا تعالیٰ کے بعد آپ ہی سب کچھ تھے۔ آپ ہی خدا تعالیٰ کا دنیا میں ظہور تھے۔ چنانچہ آپ کی وفات پر

حضرت حسان بن ثابتؓ نے کہا۔

كُنْتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِيْ فَعَمِيَ عَلَيَّ النَّاظِرُ
مَنْ شَاءَ بَعْدَكَ فَلْيَمُتْ فَعَلَيْكَ كُنْتُ اُحَاذِرُ 4

یعنی تُو تو میری آنکھ کی پتلی تھا تیرے مرنے سے میری آنکھ اندھی ہوگئی ہے۔ اب جو چاہے مرے مجھے تو صرف تیری ہی موت کا ڈر تھا۔ لیکن آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کھڑے ہوگئے اور ان کی ایسی شان ظاہر ہوئی کہ خیال کیا جانے لگا کہ آپ جیسا وجود اور پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جب آپ فوت ہوئے تو حضرت عمرؓ کھڑے ہوگئے۔ حضرت عمرؓ فوت ہوئے تو حضرت عثمانؓ کھڑے ہوگئے۔ حضرت عثمانؓ فوت ہوئے تو حضرت علیؓ کھڑے ہوگئے۔ جب حضرت علیؓ شہید ہوگئے تو چاہے آپ کے درجہ کے برابر نہ سہی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسلام کو سنبھالنے والا معاویہؓ کھڑا کردیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اِسی خاندان سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسا وجود کھڑا ہوگیا جنہیں عمر ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلتا چلا گیا۔ اِسی طرح روحانی طور پر بھی یہ سلسلہ چلا اور جب وہ وقت آگیا کہ لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ اب مسلمانوں کا کوئی سہارا نہیں تو خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیج دیا۔ اَب ہماری جماعت بھی لاکھوں کی تعداد میں ہے اور اس میں سینکڑوں ایسے طالب علم ہیں جو کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ لیکن کتنے ہیں جو پہلے کام کرنے والوں کی جگہ لینے کے لیے آگے آئے ہیں؟

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ چین میں ایک عیسائی مشنری عورت کو وحشیوں نے ماردیا اور انہوں نے اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے۔ انگریزوں نے دنیا میں یہ مشہور کردیا کہ چینی اُس کا گوشت کھا گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ سچ تھا یا جھوٹ۔ چینی لوگ تو مُردار خوار نہیں ہوتے ہاں پرانے زمانہ میں فجی کے لوگ انسان کو کھا لیتے تھے۔ مگر انگریزوں نے شاید اپنی کسی مصلحت کے ماتحت یہ مشہور کردیا کہ چینی لوگ اُس عورت کو کھا گئے ہیں۔ جونہی یہ خبر اخباروں میں شائع ہوئی شام تک پانچ ہزار عورتوں کی طرف سے اِس مضمون کی تاریں آگئیں کہ ہمیں مرنے والی عورت کی جگہ بھیج دیا جائے۔ یہ زندہ قوم کی علامت ہے کہ اُس کا ایک فرد مرتا ہے تو اُس کی جگہ لینے کے لیے کئی اَور آدمی آگے آجاتے ہیں۔

ہماری جماعت کے نوجوانوں کو بھی چاہیے تھا کہ اگر جماعت کا ایک واقفِ زندگی چالیس سال خدمت کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو دس بیس اَور نوجوان اُس کی جگہ کام کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیتے۔ ایک حد تک جماعت کے نوجوان سلسلہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں پیش تو کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے اِس امر کا افسوس ہے کہ پچھلے دنوں جب میں نے وقف کی تحریک کی تو مختلف کالجوں کے نوجوانوں نے سلسلہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں پیش کیں لیکن اِس کام میں ہمارا تعلیم الاسلام کالج سب سے پیچھے رہا۔ ہمیں تو اِس بات کی امید تھی کہ سلسلہ کے ایک مرنے والے خادم کی جگہ لینے کے لیے اِس کالج کے دس بیس نوجوان اپنی زندگیاں پیش کریں گے۔ لیکن تعجب ہے کہ باوجود اِس کے کہ اِس کالج کے پرنسپل واقفِ زندگی ہیں، اس کے بہت سے پروفیسر واقفِ زندگی ہیں اِس کالج کے کسی لڑکے نے اپنی زندگی وقف نہیں کی۔ صرف ایک نوجوان نے جو میرا پوتا ہے زندگی وقف کی ہے۔ لیکن وہ ابھی بہت چھوٹی کلاس میں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ لوگ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں کوتاہی کر رہے ہیں۔ اگر اِس کالج کے سٹوڈنٹ درد صاحب کی وفات کے بعد اپنے آپ کو پیش کرتے اور کہتے کہ وہ بھی ہماری طرح کے ایک انسان تھے اگر انہوں نے باوجود اِس کے کہ وہ ایم اے تھے اور نہایت تنگی سے گزارہ کرتے تھے چالیس سال تک سلسلہ کی خدمت کی ہے تو ہم کیوں ایسا نہیں کر سکتے تو جماعت کی ہمت کس قدر بلند ہو جاتی۔

مجھے یاد ہے جب ہم نے درد صاحب کو ولایت بھیجا ہے ان کی تنخواہ سو روپے ماہوار تھی۔ چندہ اور دوسری کٹوتیوں کے بعد انہیں ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے جس میں سے بڑا حصہ وہ اپنی والدہ کو بھیج دیتے تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں اور ان میں سے ہر ایک کے چار چار پانچ پانچ بچے تھے۔ وہ ہمارے مکان کے ہی ایک حصہ میں جو کچا تھا اور جس میں رہنا آج کل کے کلرک بھی پسند نہیں کرتے رہتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ ان کی بیویوں کے حصہ میں چار چار پانچ پانچ بچوں سمیت صرف چودہ چودہ روپے ماہوار آتے تھے۔ اب تو چودہ روپے وظیفہ پر بھی لڑکے شور مچا دیتے ہیں کہ یہ رقم بہت کم ہے۔ لیکن اُن دنوں ان کی بیویوں کے حصہ میں بچوں سمیت صرف چودہ چودہ روپے آتے تھے۔ ان کی ایک

بیوی کے بھائی جلد ساز تھے۔ جن کے پاس فرمہ شکنی کے لیے جب کوئی کتاب آتی تو وہ اُس سے فرمے منگوا لیتی تھیں اور وہ خود اور دوسری بیوی فرمے توڑ توڑ کر کچھ رقم پیدا کر لیتیں جس سے اُن کا گزارہ چلتا۔

اب دیکھو ایک شخص ایم اے ہے اور سب ججی کے لیے اُسے آفر (OFFER) آچکی ہے، وہ تبلیغ کے لیے ملک سے باہر جاتا ہے۔ سلسلہ کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اُس کے بیوی بچوں کو مناسب گزارہ دے سکے۔ اُس کی بیویوں کو اپنے گزارہ کے لیے فرمے توڑنے پڑتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اُس نے نہایت ثابت قدمی سے سلسلہ کی خدمت میں چالیس سال کا عرصہ گزار دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اُن کی وفات کے بعد جماعت کے نوجوان آگے آجاتے اور کہتے ہم اُن کا کام سنبھالنے کے لیے تیار ہیں۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سلسلہ خدا تعالیٰ کا قائم کردہ ہے اور اس کا کام سنبھالنے کے لیے نوجوان آگے آتے رہیں گے لیکن اِس وقت نوجوانوں نے ایسا نمونہ نہیں دکھایا جس سے یہ سمجھا جائے کہ جماعت میں قومی زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ سلسلہ کے کام تو خدا تعالیٰ نے کرنے ہی ہیں اور وہ اپنے فضل سے کرتا رہے گا۔ لیکن اگر وہ کام ہمارے ہاتھ سے ہوں تو ہمیں ثواب ملے گا۔ اگر درد صاحب کی وفات کے بعد فوری طور پر نوجوان اپنے آپ کو پیش کر دیتے اور کہتے کہ ہم اُن کا کام سنبھالنے کے لیے تیار ہیں تو دوسرے لوگوں کو یہ بات نظر آتی کہ یہ جماعت زندہ ہے اس لیے اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ آدمیوں کے ساتھ زندہ نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ زندہ ہے۔ اور چونکہ ایمان کو مرنے سے بچایا جا سکتا ہے اس لیے یہ قوم ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اگر نوجوان اِس طرح آگے آتے تو دنیا کے سامنے یہ نظارہ آجاتا کہ یہ قوم ایمان کے ساتھ زندہ ہے روپیہ اور آدمیوں کے ساتھ نہیں۔ روپیہ چُرایا جا سکتا ہے ایمان چوری نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی مر سکتے ہیں لیکن ایمان نہیں مرتا بلکہ سچا ایمان تو بڑھتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم مومنوں کے ایمان کو بڑھاتے ہیں[5]۔ پس جس قوم اور جس جماعت کی بنیاد ایمان پر ہوگی وہ کبھی نہیں مرے گی۔ بلکہ ہمیشہ آگے بڑھے گی۔ اُس کے افراد بے شک مرتے جائیں گے لیکن وہ جماعت ترقی کرتی چلی جائے گی۔

دیکھو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مولوی عبدالکریم صاحب

فوت ہوئے تو آپ کو اِس قدر صدمہ ہوا کہ چند دن گزرنے پر آپ نے شام کے بعد دوستوں میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ لوگوں نے کہا حضور! آپ شام کے وقت بیٹھا کرتے تھے تو بہت مزا آتا تھا، آپ گفتگو فرماتے تھے تو ہمارے ایمان ترقی کرتے تھے لیکن اب آپ نے بیٹھنا چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا جب میں باہر دوستوں میں بیٹھا کرتا تھا تو مولوی عبدالکریم صاحب میرے دائیں بیٹھے ہوتے تھے۔ اب میں بیٹھتا ہوں اور مولوی صاحب نظر نہیں آتے تو میرا دل گھٹنے لگتا ہے اس لیے میں نے مجبوراً یہ طریق چھوڑ دیا ہے۔ لیکن مولوی عبدالکریم صاحب فوت ہوئے تو سلسلہ کو اَور خادم مل گئے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کا کام مفتی محمدؓ صادق صاحب نے سنبھال لیا۔ مفتی صاحب کی صحت کمزور تھی لیکن انہوں نے خدا تعالیٰ کے فضل سے جماعتوں کے ساتھ اِس قدر خط و کتابت کی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ انہیں ایک نیا ذریعہ مل گیا ہے۔ بہرحال ان کے بعد کام چلتا چلا گیا۔ اب مولوی شیر علی صاحب قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ اور تفسیر لکھ رہے تھے۔ آپ فوت ہوئے تو میرے دل کو صدمہ ہوا کہ اُن کا کام کون سنبھالے گا؟ اِس پر خدا تعالیٰ نے ملک غلام فرید صاحب کو اِس کام کے سنبھالنے کی توفیق دے دی۔ مگر چاہیے تھا کہ ایک ایک مرنے والے کی جگہ چار چار پانچ پانچ آدمی آگے آتے اور اِس کا کام سنبھالنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے۔ یاد رکھو ہم نے قرآن کریم اور اسلام کی تعلیم کو دنیا میں پھیلانا ہے اور اس کے لیے ہمیں متواتر آدمی چاہئیں۔ جب تک ہمیں متواتر آدمی نہیں ملیں گے ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اِس وقت حالت یہ ہے کہ ریویو آف ریلیجنز کے ایڈیٹر صوفی مطیع الرحمٰن صاحب بنگالی تھے وہ سلسلہ کے کامیاب مبلغ تھے اور اُن کے تعلقات بہت وسیع تھے اس لیے باہر ان کا اثر زیادہ تھا۔ محمدؐ ناصر جو انڈونیشیا کی مسجومی 6 پارٹی کے لیڈر ہیں اور ملک کے وزیراعظم بھی رہ چکے ہیں انہیں ہم یہاں سے ریویو آف ریلیجنز بھجوایا کرتے تھے۔ کل ہی انڈونیشیا سے چٹھی آئی ہے کہ اُن کے پاس ہمارے بعض دوست ملنے کے لیے گئے تو اُن کے سیکرٹری نے بتایا کہ وہ اِس رسالہ کی باقاعدہ جلد بندی کرا کے اپنی لائبریری میں رکھتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس رسالہ کا مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہی تھی کہ رسالہ پر ایک ایسے شخص کا نام لکھا ہوا ہوتا تھا جو اسلام

کی تبلیغ کے لیے دور دور تک گیا تھا۔ اب وہ فوت ہوئے تو ہمیں اُن کا قائم مقام نہیں ملا۔ اُن کا کام چودھری مظفر الدین صاحب نے سنبھالا ہے لیکن اِن کی وہ پوزیشن نہیں جو صوفی مطیع الرحمٰن صاحب مرحوم کی تھی۔ صوفی صاحب ایم۔اے تھے اور چودھری صاحب بی۔اے ہیں۔ پھر یہ کسی جگہ بھی کامیاب مبلغ نہیں رہے۔ پہلے ہم نے انہیں پروف ریڈر کے طور پر لگایا ہوا تھا۔ اب انہیں رسالہ کا ایڈیٹر بنا دیا ہے۔ اگر ہمارے پاس ایسے واقفینِ زندگی ہوتے جو ایم اے ہوتے اور وہ انگریزی میں مضامین لکھتے، کتابیں تصنیف کرتے اور ہمیں پتا لگتا کہ مشق کی وجہ سے ان کی زبان دانی اِس معیار پر پہنچ چکی ہے کہ انہیں کسی رسالہ کا ایڈیٹر مقرر کیا جا سکتا ہے ہم صوفی صاحب کی وفات پر ان میں سے کسی کو اِس رسالہ کا ایڈیٹر مقرر کر دیتے۔ لیکن اگر کوئی مضمون نہیں لکھتا اور اپنے دل میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑی اچھی انگریزی لکھ سکتا ہے تو ہمیں اُس کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر کوئی شخص مضامین لکھتا، کتابیں تصنیف کرتا اور لوگوں پر اپنی دھاک بٹھا دیتا تو پھر ہمیں آپ ہی آپ خیال آجاتا کہ اُس کو ایڈیٹر بنا دیں۔ انگریزی زبان بہرحال تبلیغ میں کام آنے والی زبان ہے۔ اگر نوجوان انگریزی زبان میں مضامین لکھتے رہیں، کتابیں تصنیف کریں، تو اُن پر ہماری نظر رہے گی اور جب کوئی فوت ہو جائے گا تو ہم ان میں سے کسی کو اس کا قائم مقام مقرر کر سکیں گے۔

درد صاحب جب سلسلہ کی خدمت کے لیے آئے تو اُن کی عمر زیادہ نہ تھی۔ لیکن اُس عمر میں بھی اُن کے وقار کا یہ حال تھا کہ ہم انہیں بڑے سے بڑے افسر سے بھی ملنے کے لیے بھیج دیتے تو وہ نہایت کامیابی کے ساتھ جماعت کی نمائندگی کر کے آجاتے تھے۔ اگر ہم انہیں کہتے کہ وائسرائے سے ملاقات کے لیے جاؤ تو وہ فوراً اُس کی ملاقات کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اور کامیاب طور پر اُسے مل کر آتے تھے۔ کونسل کے ممبروں کے پاس انہیں بھیجا جاتا تو وہ بغیر کسی جھجک کے چلے جاتے اور نہایت کامیابی کے ساتھ سلسلہ کے کام بجا لاتے۔ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ وہ لوگ بڑے درجہ کے ہیں اور میں کمزور انسان ہوں۔ اِس وقت میں کالج کے پروفیسروں کے متعلق بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ باوجودیکہ اِس وقت ملک کی حکومت اپنی ہے انہیں اگر گورنر کے پاس بھی بھیجا جائے تو وہ کامیابی کے ساتھ کوئی کام کر سکیں۔ لیکن

درد صاحب کے اندر یہ یقین پایا جاتا تھا کہ گو میں کمزور انسان ہوں لیکن یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پھر میں اسے کیوں نہیں کرسکتا۔ اور میں سمجھتا ہوں ہر شخص کے اندر یہ مادہ پایا جانا ضروری ہے۔ اگر کسی انسان میں یہ مادہ پیدا ہو جائے تو اُس کی زبان میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ اُس کی بات سننے لگ جاتے ہیں۔

چودھری فتح محمد صاحب، میاں بشیر احمد صاحب، درد صاحب اور سید ولی اللہ شاہ صاحب سب اکٹھے آئے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو خدا تعالیٰ نے چالیس چالیس سال تک سلسلہ کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اگر خدا تعالیٰ چاہے تو ان میں سے زندہ افراد کو لمبی زندگی عطا کر کے اَور زیادہ خدمت کی توفیق بھی دے سکتا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کو ہی لے لو ہمارے نزدیک وہ 120 سال تک زندہ رہے۔ پس گو اِن کی عمریں زیادہ ہو چکی ہیں کوئی 62 سال کا ہے، کوئی 64 سال کا ہے اور کوئی 65 سال کا ہے۔ اور میری عمر تو اِس وقت 67 سال کی ہو چکی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ میں یہ طاقت ہے کہ وہ ہم میں سے بعض کو صحت والی عمر دے کر ان سے اُس وقت تک کام لے لے جب تک جماعت کے نوجوانوں کے اندر بیداری نہ پیدا ہو جائے۔ اور وہ سمجھنے نہ لگ جائیں کہ ہمیں سلسلہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ پس میں نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ وہ دین کی خدمت کے لیے آگے آئیں۔ اور صرف آگے ہی نہ آئیں بلکہ اِس ارادہ سے آگے آئیں کہ انہوں نے کام کرنا ہے۔

دیکھو! حضرت خالدؓ بن ولید نوجوان آدمی تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپ کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ اُس وقت حضرت خالدؓ بن ولید کی پوزیشن ایسی تھی کہ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے خیال کیا کہ اِس وقت اُن سے کمان لینا مناسب نہیں۔ حضرت خالدؓ بن ولید کو اپنی برطرفی کے حکم کا کسی طرح علم ہو گیا۔ وہ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کے پاس میری برطرفی کا حکم آیا ہے لیکن آپ نے ابھی تک اُس حکم کو نافذ نہیں کیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے کہا۔ خالد! تم نے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے اب بھی تم خدمت کرتے چلے جاؤ۔ خالد نے کہا یہ ٹھیک ہے لیکن خلیفہء وقت کا حکم ماننا بھی ضروری ہے۔ آپ مجھے برطرف کر دیں اور کمانڈر انچیف کا عُہدہ خود سنبھال لیں۔ میرے سپرد آپ چپڑاسی

کا کام بھی کریں گے تو میں اُسے خوشی سے کروں گا لیکن خلیفہء وقت کا حکم بہر حال جاری ہونا چاہیے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے کہا کمان تو مجھے لینی ہی پڑے گی کیونکہ خلیفہء وقت کی طرف سے یہ حکم آچکا ہے۔ لیکن تم کام کرتے جاؤ۔ خالد نے کہا آپ حکم دیتے جائیں میں کام کرتا جاؤں گا۔ چنانچہ بعد میں ایسے مواقع بھی آئے کہ جب ایک ایک مسلمان کے مقابلہ میں سَو سَو عیسائی تھا لیکن خالدؓ نے ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ ہم اُن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اپنی جانیں دیں گے اور فتح حاصل کریں گے۔ یہ وہ جرأت تھی جس نے عیسائیوں کو طاقت کے باوجود بھگا دیا۔ عیسائی بادشاہوں نے بار بار لشکر بھیجے اور ہر بار جو لشکر آتا تھا وہ پہلے لشکر سے طاقت میں بڑھ کر ہوتا تھا۔ لیکن وہ ہر دفعہ مسلمانوں سے شکست کھاتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ نے اپنے ایک جرنیل ماہان کو مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے بھیجا۔ دس لاکھ سپاہی ساتھ دیئے اور کہا کہ اگر تم نے مسلمانوں کے مقابلہ میں فتح حاصل کی تو میں تمہیں اپنی لڑکی کا رشتہ دوں گا اور اپنے تخت پر تمہیں بٹھاؤں گا۔ عیسائی مؤرخین کے بیان کے مطابق مسلمانوں کے لشکر کی تعداد صرف تیس ہزار تھی۔ بعض مؤرخین نے اس کی زیادہ سے زیادہ تعداد ساٹھ ہزار بھی بتائی ہے۔ لیکن اسلامی مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسلمان لشکر کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس ہزار تھی۔ لیکن اس بیس ہزار کے لشکر نے یا عیسائی مورخین کے بیان کے مطابق تیس ہزار یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ ہزار کے لشکر نے دس لاکھ کے لشکر کا مقابلہ کیا اور اُسے شکست دی۔ بلکہ ایک موقع تو ایسا آیا جب ساٹھ ہزار تجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل لشکر پر صرف ساٹھ مسلمانوں نے حملہ کیا۔ گویا ایک ایک مسلمان کے مقابلہ میں ایک ایک ہزار عیسائی تھے لیکن خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی۔

اگر تم بھی اپنے ایمانوں کو اس قدر بلند کر لو تو اسلام کے شکست کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ اب بھی آگے ہی بڑھتا جائے گا اور ترقی کرتا جائے گا۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ تم اپنے ایمانوں کو مضبوط کرو اور دنیا سے اپنی نگاہ ہٹا لو۔ دنیا عارضی چیز ہے۔ تم آج چار سو یا پانچ سو کی نوکری کے پیچھے نہ پڑو بلکہ اُس دن کے امیدوار رہو جب خدا تعالیٰ تم کو غلبہ دے گا اور بادشاہ تمہارے ہاتھوں کو بوسے دیں گے اور ملک تم سے درخواست کریں گے کہ ہماری حکومت تم سنبھالو۔ وہ دن خواہ ابھی دیر میں آنے والا ہو لیکن اگر تم قربانیوں میں آگے بڑھ جاؤ تو وہ قریب

آ جائے گا۔ بڑی چیز یہ ہے کہ تمہیں خدا تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی اور اُس کے حصول کے بعد دنیا کی بڑی سے بڑی نعماء بھی انسان کی نگاہ میں حقیر ہوتی ہیں۔

پس گو بظاہر وہ دن دور ہے لیکن اگر تم قربانیوں میں ترقی کرتے گئے اور اپنے ایمانوں کو تم نے مضبوط بنالیا تو اللہ تعالیٰ اُس دن کو قریب لے آئے گا اور وہ لوگوں کے دلوں کو کھول دے گا۔ اور اُس کے فرشتے لوگوں کے دلوں میں آپ تحریک شروع کر دیں گے۔ اور جب خدا تعالیٰ کے فرشتے تحریک کریں گے تو لوگ مخالفت چھوڑ کر تمہارے دوست بن جائیں گے اور تم سے محبت اور پیار کرنے لگ جائیں گے۔ پس تم اپنے اندر ہمت پیدا کرو اور خدا تعالیٰ کے اس وعدہ پر یقین رکھو کہ اسلام اور احمدیت نے دنیا پر غالب آنا ہے۔ اگر یہ فتح تمہارے ہاتھوں سے آئے تو رسول کریم ﷺ کی شفاعت تمہارے لیے وقف ہوگی کیونکہ تم اسلام کی کمزوری کو قوت سے اور اس کی شکست کو فتح سے بدل دو گے۔ خدا تعالیٰ کہے گا کہ گو قرآن کریم مَیں نے نازل کیا ہے لیکن اِس کو دنیا میں قائم ان لوگوں نے کیا ہے۔ پس اس کی برکات تم پر ایسے رنگ میں نازل ہوں گی کہ تم اس سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرو گے اور وہ تمہاری اولاد کو بھی ترقیات بخشے گا۔

میں جہاں نوجوانوں سے یہ کہتا ہوں کہ وہ اپنی زندگیاں سلسلہ کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ وہاں میں دوستوں سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ درد صاحب چونکہ زیادہ عرصہ باہر رہے ہیں اس لیے وہ اپنی اولاد کی تربیت کا خیال نہیں رکھ سکے۔ ان کا صرف ایک لڑکا تھا جس نے کسی قدر تعلیم حاصل کر لی تھی لیکن وہ بھاگ گیا۔ ان کے باقی بچے چھوٹے چھوٹے ہیں اور چھٹی چھٹی ساتویں ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ صرف ایک لڑکا فرسٹ ائیر میں پڑھتا ہے۔ دوست ان کے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے تا وہ اپنے باپ سے بھی بڑھ کر سلسلہ کی خدمت کریں۔ ان کے نانا میاں عبداللہ صاحب سنوری حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاص پیاروں میں سے تھے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم دعا کریں کہ خدا تعالیٰ اِس خاندان کو ضائع ہونے سے بچائے اور انہیں دینی اور دنیوی علوم سے متمتع فرما کر سلسلہ کی زیادہ سے زیادہ

خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔''

(الفضل 18 دسمبر 1955ء)

1: تذکرہ صفحہ 419 ایڈیشن چہارم

2: متی باب 26 آیت 42

3: ایڈنائر: (Konard Adenauer) (1876ء - 1967ء) مغربی جرمنی کا سیاستدان۔ 1949ء سے 1963ء تک مغربی جرمنی کا چانسلر رہا۔
(وکی پیڈیا آزاد دائرہ المعارف زیر لفظ ''**کونارڈ ایڈنائر**'')

4: دیوان حسان بن ثابت ''کُنتَ السَّوَادَ لِنَاظِرِی'' جلد اول صفحہ 478 قصیدہ نمبر 308 الناشر۔ المکتبۃ العلمیہ لاہور

5: وَاِذَا تُلِیَتۡ عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتُہٗ زَادَتۡھُمۡ اِیۡمَانًا (الانفال: 3)

6: مسجومی پارٹی: (MASYUMI PARTY) انڈونیشین اسلامی سیاسی پارٹی جس کی بنیاد 1945ء میں رکھی گئی۔ 1960ء میں صدر سکارنو کے حکم پر اس پارٹی پر پابندی عائد کر دی گئی۔
(وکی پیڈیا آزاد دائرہ معارف زیر لفظ (''MASYUMI PARTY''))